*اختر بلوچ

بیسویں صدی کی اردو شاعری میں انسان دوستی

Humanism in the Urdu Poetry of 20th country

The concept of Humanism is a historical one and this concept means belief on the welfare and dignity of the Humanity. Human history is a witness that social evils and division class system have badly effected human society and these have also tainted the image of humanity. Literary writers in a society are the mirror of that society. These literary figures have pointed out these negative effects. This article has been touched from the perspective of human respect and dignity. In the same veiw Human dignity has been elaborated form the work eminent poets of their times such as Iqbal, Josh, Hasrat, Jigar, Faiz etc. Poetry on humanism in the 20th country can be work worth mentioning while progressive literary movement places human dignity atop.

انسان دوستی کا نظریہ انسانوں نے خود انسانی ذات کی فلاح و بہبود کے لیے تشکیل دیا۔ اس نظریے سے مراد ایک ایسا نظام اخلاق و معاشرت ہے جو تمام انسان دوستوں کو ایک تحریک کی شکل میں منظّم کرے اور اس تحریک کے ذریعے ایسے مکالمے اور مباحث کا آغاز کیا جائے جس سے انسان دوستی کے نظریے کو مستحکم کرنے میں مدد ملے۔ انسان دوست نظریے کے تحت ایک سماجی تحریک کی بنیاد ڈالی جائے جو انسان دوستی کی عالمگیریت کو آگے بڑھائے۔ انسان دوستی سے مراد کسی ایک انسان دوست شخصیت کے خیالات کو فروغ دینا نہیں ہے بلکہ ایک ایسی فکر کا آغاز کرنا ہے جو انسانی ہستی اور عظمت کو تسلیم کرے اور ایسے تمام فلسفوں اور نظریات کو رد کرے جو انسان دوستی کی تحریک میں رکاوٹیں ڈالتے ہوں اور انسانوں میں تعلقات کی بنیاد پر نفرت کو ہوا دینا چاہتے ہوں۔ انسان دوستی ایک ایسا نظریہ ہے جس کا وجود ہمیں دنیا میں کئی سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکوں میں نظر آتا ہے۔ انسان دوستی کے نظریے کا منبع انسانی ذات ہے اور دنیا میں جو بھی مثبت سماجی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں وجود میں آئی ہیں وہ انسانی ذات کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ انسانی ذات کسی ایک خاص مذہب، نسل یا زبان تک محدود نہیں بلکہ دنیا میں کسی بھی جگہ بسنے

* جرنلسٹ ریسرچر، کراچی، سندھ، پاکستان۔ balouchah@gmail.com

والا انسان فقط انسان ہوتا ہے اور اسے جینے کی وہی حق حاصل ہے جو کسی بھی دوسرے خطے کے باسی کو ہوتا ہے۔

''انسان دوستی کے نظریات صدیوں پرانے ہیں اور ادب و شاعری میں بھی اس کے تصورات قبل از مسیح میں ملتے ہیں۔ جدید ادب اور شاعری میں پندرہویں صدی عیسوی میں انسان دوستی کا تصور واضح ہو کر سامنے ابھرتا ہے جو یورپ میں Humanism کی تحریک کے بطن سے پھوٹتا ہے''۔[۱]

اردو شاعری میں بیسویں صدی میں انسان دوستی کے تصورات کے خدوخال اور وہ کب تناور درخت بن کر ابھرے اس کے لیے ہمیں بیسویں صدی کے حالات و واقعات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ بیسویں صدی کا آغاز ہمہ گیر تبدیلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس صدی کے شروعات غلام ہندوستان میں سیاسی و قومی بیداری کے قوتوں نے جڑ پکڑنا شروع کر دیا تھا۔ بیسویں صدی سے قبل ہی ہندوستانی معاشرے میں مختلف اصلاحی تحریکوں نے جنم لے کر معاشرے کی اصلاح اور فلاح کے کام کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ تاہم یہ تحریکیں غیر سیاسی تھیں جنھوں نے ایک غیر ملکی آقا قوت سے بگاڑ کی بجائے بنا کر رکھنے میں اپنی عافیت جانی۔ سر سید احمد خان کی تحریک، راجہ موہن رائے کی تحریک، کیشب چندر کی تحریک ان تحریکوں میں نمایاں ہیں جنھوں نے سیاست کے بجائے سماج سیوا کا بیڑہ اٹھایا اور تعلیم کے میدان میں ہندوستانی معاشرے کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ اس تمام عرصے میں ہندوستان کے اندر کسی نمایاں سیاسی تحریک نے تو کوئی ہنگامہ برپا نہیں کیا تاہم ہندوستانی معاشرے کے شعور میں اس سوچ نے جنم لینا شروع کر دیا تھا جس میں ایک سامراجی قوت کی غلامی سے نجات، حریت فکر اور سماجی مساوات کے تصورات پیوستہ تھے۔ نئی تعلیم اور بدلتے ہوئے حالات نے ہندوستان کے ذہن کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ اس ذہن میں معاشرے میں استحصال، ناانصافی اور معاشی و سماجی تفاوت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس ذہن نے دنیا بھر کی ان تحریکوں کے اثرات بھی قبول کرنا شروع کر دیے تھے جن میں انسانی مساوات اور معاشی برابری کے اصولوں کو اجاگر کیا جا رہا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان اور دنیا بھر میں کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن کے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے اور جس نے ہندوستان میں پرورش پانے والے ارتقا پذیر ذہنوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہندوستان میں انگریز حکومت کی جانب سے بنگال کی تقسیم کا منصوبہ، اصلاحات کا پیکج، محدود پیمانے پر ہندوستانیوں کو حق نمائندگی دینے کا فیصلہ، تحریک خلافت، جلیانوالہ باغ کا واقعہ اور اس نوع کے واقعات نے جہاں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات میں حدت پیدا کی تو اس کے ساتھ ساتھ قومی شعور و بیداری کے تصورات کو بھی مہمیز کیا:

رہزنوں کا قصر شوریٰ، قاتلوں کی خواب گاہ
کھل کھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ
جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا
آ !انہیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ !انہیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں[۲]

بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں پہلی عالمگیر جنگ اور روس میں بالشویک انقلاب نے جہاں عالمی سطح پر دیرپا اثرات چھوڑے تو دوسری جانب ہندوستان بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے اوائل میں قومی بیداری کی جو سوچ ابھری وہ اگرچہ ہندوستان پر قابض غیر ملکی قوت کے خلاف تھی تو اس کے ساتھ ساتھ اس نے ہندوستانی سماج میں ان مسائلِ پر بھی سوچنا شروع کر دیا جس نے استحصال اور ناانصافی کے ماحول کو جنم دے رکھا تھا۔ جب پورا ہندوستانی سماج ملکی و بین الاقوامی حالات و واقعات سے متاثر ہو رہا تھا تو اس ادب اور شاعری کا اس سے متاثر نہ ہونا کسی طور پر بھی قرین قیاس نہ تھا۔ ادب اور شاعری کی اصناف تو ویسے بھی بہت زود حس ہوتی ہیں وہ تو پتا بھی کھڑکے تو اسے احاطۂ تحریر میں لے آتی ہیں اس لیے ہندوستان کے معاشرے میں بیسویں صدی کے آغاز کے بعد پیدا ہونے والے واقعات و حالات سے ہندوستانی ادب شاعری کا متاثر ہونا فطری تھا۔ ہندوستان میں اردو شاعری کی تاریخ پانچ سے چھے صدیاں پرانی ہے۔ اردو شاعری اس لحاظ سے بہت زرخیز رہی ہے کہ اسے ہندوستان کے تمام طبقات میں قبولیت عام ملی اور اس میں ہندوستان کے تمام خطوں کے رنگ نمایاں جھلکتے ہیں۔ اُردو شاعری روز اوّل سے ارتقا پذیر رہی ہے۔ اس میں جہاں عشق و محبت، ہجر و وصال اور نازنینوں اور مہ جبینوں کے عشوہ و غمزے موضوعِ سخن رہے تو زمانے کی رفتار کے ساتھ اردو شاعری کے موضوعات میں بھی تنوع ظہور پذیر ہوتا رہا۔ اردو زبان میں بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ایک بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی کے اس کے اسلوب نے جہاں عوامی رنگ اختیار کرنا شروع کیا تو اس کے ساتھ اس کے ساتھ اس میں موضوعات میں بھی بڑی تبدیلی آئی۔ معاشرے کے سلگتے ہوئے مسائل کو اردو شعرا نے جہاں موضوعِ سخن بنایا تو اس کے ساتھ اس وقت سماجی و سیاسی حالات کو بھی اردو شاعری میں سمویا۔ سیاسی و سماجی تصورات کی اردو شاعری نے آبیاری کی اور اسے یوں پروان چڑھایا کہ اردو شاعری اس کا لازمہ بن گئی۔ بیسویں صدی میں اردو شاعری میں جہاں بہت سارے تصورات نے نمایاں جگہ پائی اس میں اسے ایک انسان دوستی کا تصور ہے جو بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ اردو شاعری میں بتدریج راسخ ہوتی گئی۔ انسان دوستی کے تصور کی کونپلیں ان اعلیٰ انسانی اقدار سے پھوٹتی ہیں جو انسانی مساوات، برابری اور طبقاتی عدم تفاوت سے پھوٹتی ہیں۔ ان تصورات کا رواج اور راسخ ہونا ایک انسان دوست معاشرے کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں انسان دوستی کی روایت روز اول سے ملتی ہے۔ اردو زبان کے پہلے شاعر ولی دکنی کا ایک شعر اس بات کا غماز ہے کہ سماجی اور انسانی مسائل روز اول سے اردو شعراء کے پیش نظر تھے۔ ولی دکنی کا شعر انسان دوستی کے تصور کو اجاگر کرتا ہے:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے
باعث رسوائی عالم ولی
مفلسی ہے ، مفلسی ہے ، مفلسی [۳]

انسان کی زندگی میں اصناف شعروادب انتہائی اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ یہ وہ اصناف ہیں جن کے ذریعے وہ نہ صرف خود پر گزرنے والے مصائب کو بیان کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ پورے معاشرے کا ایسا نقشہ کھینچتا ہے جس سے پڑھنے والے کو اس دور کے حالات کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ دور قدیم سے لے کر آج تک شعروادب ارتقائی منازل طے کر رہا ہے اور ہر دور میں شعراء نے اپنے وقت کے تقاضوں سے متاثر ہو کر اقلیم سخن میں اپنے رنگ بکھیرے۔ ہر دور میں اردو شاعری نے وقت کے تقاضوں کو اپنے اندر سمویا اور وقت کے ضروریات سے ہم اہنگ ہو کر انسان کی خوشی، مسرت، رنج، درد اور تکلیف کو زبان دی۔ اردو شاعری نے بیسویں صدی میں انسان دوستی کی جس معراج کو چھوا وہ اس کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اردو زبان ایک محکوم خطے کی زبان تھی جس کے اندر بسنے والے ایک غیر ملکی کی حکمرانی کے جال میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ سامراجی قوت اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ہر نوع کے جبر وظلم کے ہتھکنڈوں سے لیس تھی۔ اس غیر ملکی قوت کے سامراجی عزائم کی آبیاری کے لیے انسانی احساسات، خیالات اور جذبات کی پرکاہ حیثیت نہیں تھی۔ اس کا مطمع نظر استحصال کے ذریعے اپنی قوت واختیار میں اضافہ اور اپنی حکومت کی طوالت تھی۔ اردو شاعری میں اس دور میں انسان دوستی کے عناصر نے بے پایاں جگہ پائی اور انسان دوستی کے اجزاء سے مزین اردو شاعری نے حریت فکر اور آزادی کے حصول کی تمنا کی شمع کو فروزاں رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک استحصال زدہ معاشرے میں جہاں اردو شاعری کے انسان دوستی کی فکر نے ایک غیر ملکی سامراج کی پالیسیوں کو اپنے نشانے پر رکھا تو اس کے ساتھ معاشرے کی معاشی، سماجی اور طبقاتی ناہمواریوں کو بھی موضوع سخن بنایا۔ معاشرے کے اندر انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال اور جبر وظلم روا رکھنے کی رسومات کے خلاف اردو شاعری نے ایک بھرپور جدوجہد کی اور ایک استحصال، جبر اور ناانصافی سے پاک معاشرے کو حرز جاں بنائے رکھا۔ اردو میں انسان دوست شاعری کا سب سے بڑا وصف اس کا امن و آشتی، روادی اور برداشت وتحمل ہے۔ اس شاعری نے آفاقی انسانی قدروں کی پاسداری کرتے ہوئے انسانوں سے نفرت کا سبق نہیں دیا۔ اس شاعری نے ظلم سے تو نفرت کی لیکن ظالم کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے اسے ترغیب، تلقین اور تبلیغ کی۔ اس شاعری نے معاشرے کو ایک مثالی معاشرے کا آدرش پالا اور اس کے حصول کے لیے انسانوں کو ترغیب کی کہ جہاں مذہب، نسل اور زبان کی بنیاد پر کسی سے نفرت اور امتیازی سلوک نہ برتا جائے۔ وہ اس مثالی معاشرے کے لیے تمام طبقات کی شرکت کو لازمی سمجھتے ہیں اور اگر کوئی قوت اس کے خلاف مزاحم ہوتی ہے تو اس کی کوششوں کو ناکام بنانے کی تلقین وترغیب دیتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ظلم واستبداد کا جو دور آیا اس نے پورے ہندوستان میں بیداری کی لہر کو تیز کر دیا تھا۔ جلیانوالہ باغ کے خونیں واقعے نے ہندوستانیوں کے دلوں میں سیاسی بیداری کی لہر کو پیدا کر دیا تھا۔ جلیانوالہ باغ میں جس طرح معصوم انسانوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا وہ اس وقت کے ہندوستانی سماج میں انسانوں کی محکومی وغلامی کی کھلی علامت تھی کہ کس طرح ایک غیر ملکی وقت اس وقت کے ہندوستان میں بسنے والے انسانوں کو ایک حقیر شے سے زیادہ کی وقعت دینے کو تیار نہ تھی۔ اس واقعے میں جہاں انسانوں پر ظلم ڈھایا گیا تو اس کے اردو شاعری کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس ظلم وبربریت کے خلاف

جب عوامی جذبات میں حدت و گرمی بڑھی تو اس نے شاعری میں جگہ پائی۔ اس ظلم و جبر کے خلاف اس وقت کی اردو شاعری میں کس نوع کے انسان دوست اور وطن دوست جذبات پروان چڑھے اس کا اظہار ان چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے [۴]

ہندوستان میں جب اندرونی و بیرونی واقعات نے اثرات مرتب کرنا شروع کیے تو ہندوستانی سماج میں بیداری و آگہی نے بھی جنم لینا شروع کر دیا۔ زندگی اور سماج کے بنیادی مسائل موضوع سخن بننا شروع ہوئے۔ بھوک، افلاس، سماجی پستی، غلامی کے مسائل، غیر ملکی سامراج کے خلاف جدو جہد، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندانہ اور ماضی پرستی کے خیالات کا تدارک اور عقلیت پسندی کے رجحانات جیسے موضوعات نے اردو شاعری میں جگہ بنانا شروع کر دی۔ ان موضوعات کی اس وقت کی اردو شاعری میں بھرمار ہوگئی اور اقلیم سخن کا ایک سے ایک شہسوار ان موضوعات پر جھنڈے گاڑتا چلا گیا۔ یہ تمام شاعری انسان دوستی کے جذبات سے مزین تھی جس میں انسان اول و آخر موضوع تھا۔ اس کی پستی، جہالت اور افلاس اور اس سے س سطح تک لانے والی قوتیں اردو شاعری میں موضوع سخن ٹھہریں۔ انسانوں کو شرف انسانیت کے مقام کی پہچان کرانے کے لیے اردو شاعری میں شعور و آگہی کے خیالات بھی جوق در جوق امڈ آئے تا کہ انسانی سماج کو مساوات، برابری اور توازن کے خطوط پر استوار کیا جا سکے جہاں استحصال، جبر اور غلامی کا شائبہ تک نہ ہو۔ طبقاتی تقسیم جو سماجی ناہمواریوں کو جنم دے رہی تھی اس کے خلاف اردو شاعری نے قلم اٹھایا۔ مزدوروں اور کسانوں کی مفلوک الحالی موضوع سخن بنی۔ اردو شاعری میں مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کو جگہ ملی، شاعرانہ تک بندی میں مزدوروں اور کسانوں کی حالت زار کو کچھ ایسے رنگ میں پیش کیا گیا کہ اسے پڑھتے ہی رحم اور ترس کے جذبات دل و دماغ میں عود آتے ہیں۔ ان طبقات کے شب و روز اور استحصال و جبر کی بھٹی میں گزرنے والے ماہ و سال کو اردو شعراء نے مشاہدے کے بعد سخن کے قالب میں ڈھالا ۔

اس شاعری میں محنت کش طبقے کی الم انگیز زندگی چھپی ہے جو عام انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ ناسازگار حالات کی چکی نے اس طبقے کو پیس کر خاک میں ملایا ہوتھا لیکن اردو شاعری نے ان میں عظمت انسانی کے ایسے جواہر تلاش کیے جو طبقے کو مقام انسانیت کے اونچے درجے پر فائز کرتا ہے۔ اس نوع کی اردو شاعری میں وہ ان طبقات کی تمام تر محرومیوں کے باوجود وہ اس طبقے کو خراج تحسین پیش کرتی ہے کہ وہ قوت بازو پر بھروسہ کرنے والا طبقہ ہے جو خودداری، غیرت اور حمیت کی خصوصیات سے مالا مال ہے جو ایک اعلیٰ انسانی معاشرے کی تعمیر کے لیے بہت ضروری ہیں۔ مزدور اپنے تنگ و تاریک جھونپڑوں میں بے چارگی اور مفلسی کی زندگی گزارنے کے باوجود محبت و مروت اور ایثار و قربانی کے پیکر ہیں۔

مفلسوں اور غریب طبقات کی محرومیوں اور مجبوریوں کو بھی اردو شعراء نے مرکز نگاہ بنایا۔ شکم کی آگ اور وجود پر لگنے والے بھوک و افلاس کے چرکوں جیسے موضوعات انسان دوستی کے جذبات سے پھوٹ رہے تھے جو اردو شعراء کے قلب و ذہن پر حاوی تھی:

جب بھوک سے پھٹ جاتا ہے مفلس کا کلیجا
کہتا ہے ''خدا نے مجھے کیوں دہر میں بھیجا''
بھولا سا یہ بچہ بہشتوں کا کھلونا
کیوں اس کے مقدر میں ہے دن رات کا رونا
یا بھوک مٹانے کا بجھا کوئی طریقہ
یا چین سے مرنے کا بتا کوئی سلیقہ
سنتا ہوں جب افلاس کی پردرد کراہیں
احساس کی قندیل سے جلتی ہیں نگاہیں

اردو شاعری میں انسان دوستی کے احساسات سے متاثر شعراء نے معاشی بدحالی اور طبقاتی تقسیم کے خلاف جدوجہد کے جذبے کو ابھارنے اور انقلاب کے احساس کو جگانے میں اپنے فن سے بڑا کام لیا۔ اگرچہ بعض شعراء نے سطحی اور جذباتی نعرے باری سے بھی کام لیا لیکن اس شاعری کا ایک بڑا حصہ مقامی و بین الاقوامی حالات کے گہرے شعور و ادراک اور مشاہدے اور مطالعے کے بعد وجود میں آیا۔ اس شاعری میں انسانی سماج کی حرکیات اور عوامل کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور ان تمام امور کو احاطہ کیا گیا جو طبقاتی نظام کو پیدا کرنے اور انسانوں کو طبقاتی بنیادوں پر امتیازارت کا شکار کرتے ہیں۔ اس شاعری میں ان مذہبی بندشوں کو بھی چھیڑا گیا جو تقدیس کی بیڑیوں میں لوگوں کو جکڑ کر انہیں غلامی اور محکومی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مذہب کے نام نہاد اجارہ داروں کے ہاتھوں انسانوں کو تذلیل اور سماج کی ترقی میں ان کی طرف سے پیدا کردہ رکاوٹیں اردو شاعری کا موضوع ٹھہریں۔ اس شاعری نے مذہب سے انکار نہیں کیا لیکن مذہب کے نام پر انسانوں کے استحصال کے خلاف کھل کر بات کی۔ اس شاعری نے تشکیک کے پٹ وا کیے اور ان مذہبی رسومات اور رواجوں کو بھی چھیڑا جو انسانوں کو غلامی و اندھی تقلید پر قائل کرتے ہیں۔

اردو شاعری میں انسان دوستی کے تصور کو مزید اس وقت تقویت ملی جب ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد رکھی گئی اور اسکے فروغ نے اردو شاعری میں انسان دوستی کے تصورات اور موضوعات کو مہمیز کیا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کے سرمایے میں جو اضافہ کیا وہ ایک مسلمہ حقیقت بن کر اس شاعری کو مزید معتبر بنا دیتا ہے کہ کس طرح اہل سخن نے اس میں بیش قدر اضافہ کیا۔ ترقی پسند تحریک کے سائے تلے پروان چڑھنے والی انسان دوست شاعری نے فکر و فن کی ایسی قندیلوں کو روشن کیا کہ جنہیں وقت کی تیز آندھیاں بھی نہ بجھا سکیں اور وہ آج بھی مشعل راہ بن کر انسان دوستی کے راہ پر چلنے والے اہل سخن

کے قافلوں کی رہ نمائی کرتے نظر آتے ہیں۔اس تحریک کے نتیجے میں انسان دوستی کے رجحانات کو فروغ حاصل ہوا اور ان شعراء کو بھی انسان دوستی کے رجحانات کو طرف موڑا جو اس سے پہلے عشق اور داستان رنج وغم کے اسیر تھے۔انسان دوست شاعری کے بدلتے تقاضوں کو ترقی پسند ادبی تحریک نے خوب نبھایا۔اردو میں انسان دوست شاعری اصل میں انقلابی شاعری تھی جو محکوموں، مجبوروں اور مقہوروں کے دلوں کو گرماتی تھی اور زبردستوں، ظالموں اور جابروں کے دل دھلاتی تھیں۔اس انسان دوست شاعری کا اسلوب باغیانہ تھا جس میں روایت پسندی سے بغاوت کا آہنگ دکھائی دیتا ہے۔یہ شاعری ایک نئے جہان کی تعمیر کا سندیسہ دیتی ہے کہ جس میں آزادی اور انقلاب کے جذبات امڈتے نظر آتے ہیں۔اس شاعری میں جنون، جوش اور جذبہ ہے:

وہ دنیا جس کا ہر ذرہ برابر دوش ہوتا ہے
وہ دنیا جس کے سینے میں بلا کا جوش ہوتا ہے
جہاں ہر دل میں آزادی کی ہوتی ہے لگن
جہاں ہوتا ہے شوق جاں نثاری وطن پیدا
تجھے اے نوجواں ایسا جہاں تیار کرنا ہے
اسی کوشش میں جینا ہے اسی کوشش میں مرنا ہے [۵]

اس دور کی انسان دوست شاعری میں ظلم وزیادتی، ناانصافی اور استحصال کے خلاف غصے جذبات ملتے ہیں یہ شاعری اس فرسودہ نظام کو جلا کر خاکستر کرنے کی دعوت دیتی نظر آتی ہے جس نے انسان کو غلامی اور محکومی کی بندشوں میں جکڑ رکھا ہے تا کہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کی جا سکے جس میں انسان آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہو:

ختم ہو جانے کو ہے سرمایہ داری نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
گر پڑیں گے خوف سے ایوان عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشوں میں شراب لالہ گوں [۶]

اس تحریک نے انسان دوستی کے تصور کو پروان چڑھایا اور اپنی شاعری کے ذریعے دنیا کو ایسی جگہ بنانے کا خواب دیکھا جس میں انسان پیار، محبت امن اور آشتی سے رہ سکے۔اس دنیا میں انسان جنگوں سے محفوظ ہو۔جھگڑوں کا فیصلہ تلوار، بندوق اور توپ سے نہ ہو بلکہ باہمی صلح صفائی سے ہوا۔ترقی پسند تحریک نے انسان دوستی کے تصور کے تحت ایک عالمگیر معاشرے کی تشکیل کی شاعری میں صورت گری کی جو انسانوں کے درمیان باہمی عزت واحترام کے رشتوں کو پروان چڑھا سکے اور جس میں انسان طبقاتی، مذہبی، لسانی اور نسلی امتیازات کا شکار نہ ہو۔انسان دوستی کا یہی تصور تھا کہ جب دوسری جنگ عظیم کی شروعات ہوئیں تو ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے اس کے متعلق جو پالیسی اپنائی وہ جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی کے مشترکہ بیان سے ظاہر ہو

جو دہلی کانفرنس میں بیان کی گئی۔ اس بیان میں انہوں نے کہا:

''ہمارا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں، ہماری زندگی فن شعر اور علم و ادب سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن باوجود تخلیقی و تعمیری جدوجہد کے ہمارا ایک سیاسی عقیدہ ہے جسے ہم شاعر و ادیب اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ انسانی تہذیب و تمدن کی وہ بنیادیں خطرے میں ہیں جن پر آزادی اور نسل انسانی کی ارتقائی عمارت چنی جاتی ہے۔ ان تمام قدروں کے مٹ جانے کا شدید خطرہ ہے جو انسانی سماج کے لیے مسرت، امن، انفرادی آزادی اور اجتماعی زندگی کا پیغام دیتی ہیں۔ اگر فاشزم کو اس جنگ میں کامیابی ہوتی ہے تو تمام دنیا میں بجائے ایک نورانی مستقبل کے ایک تاریک عہد کا آغاز ہوگا۔ آزادی خیال و رائے کا چراغ گل ہو جائے گا۔ علم و ادب اور فنون لطیفہ کا دنیا میں نام و نشان باقی نہیں رہے گا''[۷]

بیسویں صدی میں انسان دوستی ایک ایسا موضوع رہا جسے ہر شاعر نے اپنی شاعرانہ تخلیق میں اپنی سوچ، فہم، ادراک اور مشاہدے کی بنیاد پر پروان چڑھایا۔ اردو شاعری میں انسان دوستی کے اسی تصور کو پروان چڑھایا کہ فطری طور پر انسان، انسان سے نفرت نہیں کرتا بلکہ یہ حالات و واقعات، تعصّبات اور تضادات ہیں جو اقوام عالم سے لے کر ایک چھوٹی سی کمیونٹی میں انسانوں کے انسانوں کے خون کا پیاسا بنا دیتے ہیں۔ اردو شاعری نے بیسویں صدی میں جن خونریز واقعات کا مشاہدہ کیا اس کا دکھ درد اور رنج و غم اس شاعرانہ تک بندی سے بے پایاں جھلکتا ہے جو بیسویں صدی میں اردو شعراء کے نخل فکر سے پھوٹی۔ بیسویں صدی میں جب اردو شاعری کا زیادہ تر فوکس اپنے گرد و پیش کے حالات پر رہا لیکن اس کے ساتھ عالمی حالات و واقعات نے بھی اسے شدید تر متاثر کیا۔ انگریز سامراج کے ہاتھوں غلام بننے والے ہندوستانی سماج کے انسانی موضوعات نے جہاں اردو شاعری میں جگہ بنائی اس کے ساتھ ساتھ ان انسانی المیوں نے بھی اردو شاعری کی توجہ اپنی جانب مبذول کی جو اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات سے پیدا ہو رہے تھے۔

۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء میں بنگال میں پیدا ہونے والا قحط ایک ایسا المیہ تھا جس کی ہندوستان میں مثال نہیں ملتی تھی۔ اس وقت کوئی ایسا حساس اور انسان دوست شخص نہ تھا جو اس واقعہ پر رنجیدہ نہ ہو۔ قحط میں ہلاک ہونے والوں کی تفصیلات اور تصاویر دیکھ کر لوگوں کے دل دہل جاتے۔ اردو شاعری کے اہل سخن بھی اس قحط سے بہت متاثر ہوئے اور بہت سے شعراء نے اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ سامراجی حکومت کے خلاف اس قحط بنگال کی وجہ سے بے پایاں لکھا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ اہل بنگال کے ساتھ ہمدردی اور ان کے دکھوں پر رنج و الم کا اظہار کیا گیا۔ بہت ساری نظمیں قحط بنگال پر لکھی گئیں جنہوں نے بنگال میں بھوک کے ہاتھوں بلکتی اور سسکتی انسانیت کی منظر کشی کی اس نے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جب تقسیم ہند کا مرحلہ آن پہنچا اور ہندوستان مذہبی منافرت کے انتہاؤں کو چھونے لگا تو خون کی ندیاں چہار سو اس طرح بہہ نکلیں کہ اس میں انسانی لاشے تیرتے نظر آئے۔ تقسیم ہند کے ہنگام برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے جہاں ہر ذی حس کو جھنجھوڑا وہیں اس کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں اس انسانی المیے کو یوں جگہ ملی کہ آج بھی اس دور کی شاعری رگوں میں خون منجمد کر دے کہ انسانیت کو کس طرح سرحد

کے دونوں پار ذبح کیا گیا۔ اردو شاعری میں تقسیم ہند کے وقت جنم لینے والے سانحات اور حادثات کو جب موضوع سخن بنایا گیا تو پھر اس نے اپنے پرائے کی تمیز نہیں رکھی، مذہب، زبان اور نسل کی بنیاد پر بھی اردو شعراء نے کوئی امتیاز نہیں برتا۔ اس وقت منصۂ شہود پر ابھرنے والی اردو شاعری میں فقط انسانیت اور اس کا زندہ درگور ہونا موضوع سخن ٹھہرا۔ انسانیت جہاں جہاں پامال ہوئی اور جس جس کے ہاتھوں اس کے وجود پر چرکے لگے اردو شاعری اس پر ماتم کناں ہوئی۔ اردو میں اس وقت کی انسان دوست شاعری نے جن رجحانات کو جنم دیا اس نے سرحد کے دونوں پار بسنے والے شعراء کرام کو یکجا کر دیا کہ جو انسانیت پر ڈھائے جانے والے مظالم پر یک زبان ہو کر اس کے خلاف مزاحم ہوئے۔ پاکستان اور ہندوستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات سے جو سماجی، سیاسی اور تہذیبی انحطاط پیدا ہوا اس نے انسانی قدروں اور رشتوں کے بارے میں بے یقینی پیدا کر دی تھی۔ ان فسادات نے نے ذہنوں کو پراگندہ کر دیا تھا۔ ان فسادات سے عام انسانوں کے ساتھ ساتھ اردو شعراء بھی شدید متاثر ہوا۔ کسی کو اپنے عزیز و اقارب کی جدائی کا داغ سہنا پڑا تو کسی کو ہجرت کے مصائب جھیلنے پڑے۔ اگر چہ سرحد کے دونوں طرف فرقہ واریت کی بدبو سے کچھ اذہان مسموم ہوئے کہ جن کی شاعری میں نفرت انگیز جذبات کی جھلک دکھائی دیت ہے تاہم اردو شعراء کی بڑی تعداد نے منفی رجحانات کے خلاف جا کر فقط اور فقط انسانیت کا مقدمہ لڑا اور انسانیت کے ساتھ ہونے والے ظلم کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اگر چہ شاعری میں ہیجان بھی نظر آیا لیکن مطمع نظر انسانیت کا مشن ہی تھا۔ یہ اردو شاعری کا وصف تھا کہ اس پر خطر اور پر فتن دور میں بھی اس نے سچائی اور انسانیت کا دامن نہیں چھوڑا۔ جب تعصّبات اپنے عروج پر ہوں اور چار سو خطرات منڈلا رہے ہوں تو مخالف فریق کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو دبے نہیں بلکہ بلند آہنگ میں موضوع سخن بنا کر اسے انسانیت کے خلاف ظلم قرار دینا کسی جہاد سے کم نہ تھا لیکن اردو شعراء نے یہ خطرہ مول لیا اور فسادات کی ذمہ داری ان فریقوں پر ڈالی جو اپنے سیاسی مفادات کے لیے انسانی جانوں کو بھینٹ چڑھا رہے تھے۔ اس پر خطر اور ہیجان زدہ ماحول میں کسی ایسے شعری فن پارے کی تخلیق کرنا جو صحت زاویہ نظر کی ترجمانی کرتا ہو اور دوسری طرف تجزیہ و تحلیل کی منزلوں سے گزر کر تکمیل فن کا بھی مظہر ہو بہت مشکل تھا لیکن اردو شاعری نے اس مشکل مرحلے کو کمال خوبی سے انجام دیا اور انسان دوست شاعری کے جو فن پارے اس دور میں منظر عام پر ابھرے وہ اس کی انسانیت نوازی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ اس دور کی اردو شاعری نے ان رجعت پسندانہ قوتوں کی بھی حوصلہ شکنی کی جو اردو ادب اور شاعری کو دبانے کے درپے تھیں اور اسے ایک خاص مذہب کے لوگوں کے ساتھ نتھی کر کے اسے ہندوستان سے باہر نکالنے کی کوششوں میں مصروف عمل تھیں۔ اردو شاعری کے اندر انسان دوستی کی تحریک نے ان رجعت پسند قوتوں کے مقابلے میں محاذ کھڑا کر دیا اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو شاعری فقط انسانیت نوازی کے جذبات، خیالات اور احساسات کی داعی ہے اور تعصب، جانبداری اور امتیازات کے جالوں میں پھنس کر وہ ہیجان اور افراط وتفریط کے رستے پر گامزن ہونے کے خلاف ہے۔ آزادی کے وقت برپا ہونے والے فسادت نے لوگوں کے جسموں، ذہنوں اور روحوں پر ایسے چرکے لگائے کہ جن کی کسک دیر تک محسوس کی گئی۔ اردو شاعری میں جہاں ان المیوں پر نوحہ خوانی کی گئی اور اس

کے ساتھ آزادی کی مسرت وخوشی کے جذبات کو جگہ ملی تو اس کے ساتھ ذمہ داریوں کے احساس نے بھی اردو شاعری میں جگہ بنانا شروع کی۔ ان لوگوں نے آزادی کے ساتھ جو تیرگیاں تھیں انہیں موضوع سخن بنایا۔ حصول آزادی کے بعد ایک بہتر اور سماجی و معاشی طور پر ہموار معاشرے کے قیام کے خواب ان شعراء کے کلام میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ امن وسلامتی، معاشی آسودگی اور سیاسی آزادی کے زریں تصورات کو اردو شاعری نے اپنے اندر جگہ دینا شروع کی تو کہ سماج میں بسنے والے انسانوں کو صدیوں کی جاگیردارنہ اور سامراجانہ غلامی کے بعد آزادی کی نعمت سے صحیح طور پر بہرہ ور ہونے کا موقع ملے۔ شعراء کے سامنے آزادی کے بعد بھی بہت سے مسائل تھے کہ سیاسی محکومی زنجیریں تو کٹ چکیں لیکن ذہنی غلامی کے پھندے ابھی تک سماج میں باقی تھے۔ صدیوں کی محکومی اور غلامی نے معاشرت اور تہذیب وتمدن کو اس طرح مفلوج کر دیا تھا کہ انسان آزادی سے صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہوسکتا تھا۔ شعراء نے معاشرتی ومسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اپنے اپنے سماجی وذہنی پس منظر کے تحت انسان دوست شاعری کے محاذ پر فن سخن سے اپنے رنگ بکھیرتے رہے۔ انہوں نے پیچیدہ مسائل کی گرہیں کھولنی شروع کیں جس پر انہیں تعزیز وتادیب کے لمحات کا بھی سامنا کرنا پڑا کیونکہ سامراجی حکومت سے ملنے والا نظام آزادی کو ابھی تک ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ آزادی کے بعد سامراجی ذہنیت کے خلاف اردو شاعری میں بہت کچھ لکھا گیا۔ خاص کر شہری اور جمہوری آزادیوں کو یقینی بنانے کے لیے اردو شعراء کا کلام ان کے فکری وذہنی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ سرمایہ داری نظام اور سامراجی سوچ کے پنجے میں پھنس کر رہ جانے والے عوام کے ساتھ ادیب، فن کار اور دوسرے طبقات کے مصائب کو اردو شاعری نے اپنا موضوع بنایا۔ آزادی کے بعد بھی حکومتوں نے جب شہری آزادیوں کو سلب کرنا شروع کر دیا اور متوسط اور محنت کش طبقے کی آوازوں کو دبانا شروع کر دیا تو اردو شاعری نے اس محاذ پر اپنی انسان دوستی کا واضح ثبوت دیا۔ اس دور میں شاعری میں انسان دوست رجحانات کو بڑھاوا ملا۔ اس ددر میں شاعروں اور ادیبوں کا یہ فرض سمجھا گیا کہ وہ اظہار خیال کے لیے جدو جہد کریں، جمہوری اداروں کی بقا اور ان کی نشو ونما کے لیے جدو جہد کریں اور اس کے ساتھ معاشرے میں بسنے والے انسانوں کے معیار زندگی کو بڑھانے اور تعلیم، تہذیب اور تمدن کو آزادی کے ساتھ حاصل کرنے کی جدو جہد میں شریک کار ہوں۔

اردو شاعری میں جہاں معاشرے کے مختلف طبقات مسائل کو موضوع سخن بنایا گیا تو اس کے ساتھ انسانی معاشرے کا جزو لاینفک یعنی عورت کے مسائل اور اس کے لیے سماجی ومعاشرتی تکالیف بھی شاعری کا موضوع بنیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب سامراجی نظام کے خلاف کے جدو جہد اردو شاعری میں نمایاں نظر آتی ہے تو عورت کے مسائل کو اس طرح موضوع بنایا گیا۔ تاہم آزادی کے بعد اس پہلو کا جھلک ہمیں اردو شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس شاعری میں عورت کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ اپنا ذہن رکھتی ہے۔ اس کا ایک اپنا تشخص ہے۔ اس کی ایک سوچ ہے۔ اسے معاشرے میں ترقی کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی مرد کو حاصل ہوتا ہے اور اس حق کے حصول کے لیے اسے تمام مواقع ملنے چاہئیں۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بہت سی قبائلی اور جہالانہ رسومات جس میں عورت کو تختہ مشق بنایا جاتا ہے اسے اردو شاعری کے ذریعے اجاگر کیا گیا اور ان کی بیخ کنی

کے لیے اردو شاعری میں خاص کر خواتین شعراء نے اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔ ان غلط روایات کے خلاف آواز اٹھائی گئی، عورت کے ساتھ ہونے والے ذہنی و جسمانی تشدد کو انتہائی موثر انداز میں اردو شاعری میں جگہ ملی۔ شاعری میں عورت کے فقط رومانوی تصور کی بجائے اس کے مسائل کو جگہ ملی۔ معاشرے میں اس کے خلاف ہونے والی ظلم و زیادتی کو شاعری میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور انھیں برابر کا انسان سمجھنے اور یہ حق دلانے کے لیے اردو شاعری میں بے پناہ کلام لکھا گیا۔ ایک پدرسری معاشرے میں عورت کے استحصال کے خلاف مسلسل آوازوں کے اٹھنے سے معاشرے میں عورت نے اگرچہ آہستہ ہی سہی لیکن وہ مقام حاصل کرنا شروع کر دیا جو شعراء نے اپنے تصور میں ان کے لیے تخلیق کیا تھا۔ اردو شاعری میں ادا جعفری، زہرہ نگار، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے ساتھ اور بہت سی خواتین شعراء نے بیسویں صدی میں اپنے سخن کے رنگ بکھیرے۔ انہوں نے مرد کے استحصالی معاشرے میں جرات اظہار سے عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا۔ ان کا لہجہ بیباک اور انداز پرشکوہ تھا۔ اس سلسلے میں ترقی پسند تحریک نے بھی اردو میں خواتین شعراء کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بہت مدد فراہم کی اور انہیں اپنے آپ کو تسلیم کروانے کے لیے مواقع فراہم کیے۔ ان شاعرات نے تخلیقی وژن سے عورت کی زندگی کو موضوع بنایا اور عورت کو جرات اظہار کا قرینہ سکھایا کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر مہر بہ لب نہ رہے بلکہ اس پر بول پڑے اور اپنے حالات زندگی کو بدلنے کی سعی کرے:

مدتوں بعد آئی ہو
اور تمھیں اتنی فرصت کہاں ہے
ان کہے حرف بھی سن سکو
آرزو کی وہ تحریر بھی پڑھ سکو
جو ابھی تک لکھی نہیں جا سکی
اتنی مہلت کہاں
میرے باغوں میں جو کھل نہ پائے ابھی
ان شگوفوں کی باتیں کرے
درد ہی بانٹ لو
میرے کن ماہتابوں سے تم مل سکیں
کتنی آنکھوں کے خوابوں سے تم مل سکیں
ہاں تمھاری نگاہ ستائش نے
گھر کی سب آرائشیں دیکھ لیں
میرے دل میں جو پیکاں ترازو ہوئے
تم بھی
لالہ و گل کے بے ساختہ استعارے لگے [۸]

بیسویں صدی میں اردو شاعری میں انسان دوستی کے تصور کو پروان چڑھانے والے شعراء کرام میں بلاشبہ علامہ محمد اقبال کا نام سرفہرست ہوگا۔ ڈاکٹر کی اردو شاعری کا بنظر غائر مطالعہ قاری کو ان کے مذہب انسانیت پر ایمان کے پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔ اقبال کی شاعری کے مختلف ادوار ہیں جس میں ان کا ارتقاء پذیر ذہن شاعری کے ذریعے نئی نئی دنیائیں بازیافت کرتا رہا۔ تاہم اقبال کی شاعری کے ہر دور میں ایک قدر مشترک ہے وہ ان کی خوئے انسانیت نوازی اور انسانیت کو لاحق دکھوں پر ان کا تڑپ جانا۔ اقبال جب اپنی شاعری کے مختلف ادوار سے گزر کر اپنی فکر کی انتہا تک پہنچتے ہیں تو انسانیت دوستی کا پہلو بھی ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی فکری انتہا میں انسان اور انسانیت نوازی کا پہلو کس طرح زیادہ جھلکتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اب انسان کو بار بار یہ تلقین کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ کائنات کے سربستہ رازوں کو کھنگالنے کے لیے دنیا میں اتارا گیا تھا اور اس کی زندگی کا اول و آخر مقصد یہی ہونا چاہئے کہ قدرت کے خفیہ گوشوں کو عیاں کرنے کے مشن پر گامزن ہو جا۔ کلام اقبال میں، اُنکا یہ وہ حیات آفریں دور ہے جس میں اقبال کی شاعری کی صلاحتیں پیغمبرانہ شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری اردو ادب کے خزینے میں ایک گرانقدر اضافہ ہے جس میں اقبال کی فکر اور تخیل اونچی اڑان پر ہے۔ ان کا تخیل پرواز انسان دوستی کے جذبات میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور اس میں بھی کہیں بھی تعصب کا شائبہ تک نہیں۔ اقبال کے تخل فکر سے جب ہندوستان کی محبت میں سرشار کلام پھوٹ رہا تھا یا جب وہ اپنے ہم مذہبوں کے اندر عقابی روح بیدار کرنے کے لیے شاعرانہ سخن کا سہارا لیتے ہیں تو وہ دراصل انہیں انسانیت کے ان اعلیٰ مقاصد کے لیے بیدار کر رہے ہوتے ہیں جو دور غلامی و ذلت میں ان سے کوسوں دور ہو چکے ہیں۔ یہ ماضی کی عظمت رفتہ کی یاد دلانے کی کاوش سے لے کر ان کے ناگفتہ بہ حال پر نوحہ پڑھتی نظر آتی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کے بارے میں ایک امید بھی جگاتی ہے کہ وہ اگر یقین محکم ہو اور جہد مسلسل ہو تو کچھ بھی زندہ گانی میں مشکل نہیں۔ اقبال کا انسان دوستی کا پیغام دوسرے شعراء سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب میں رہ کر معاشروں کو بہت عمیق گہرائی میں مطالعہ کیا۔ دو مختلف تہذیبوں میں پیوست روایات، رسومات، تمدن اور عادات و اطوار کا بغور مطالعہ کیا اور پھر کسی خاص نتیجے پر پہنچ کر وہ ایسی شاعری سے قلب و ذہن پر جوت جگاتے ہیں جو انسان کے اندر ایک امنگ، امید، تمنا اور منزل کے حصول کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اقبال اگر مغرب کی تہذیب پر تنقید کرتے ہیں تو وہ دراصل اس کے استحصالانہ کردار پر انگشت نمائی کرتے ہیں جس نے سامراجی قوت کا روپ دھار کر غریب اور کمزور معاشروں کو اپنے پنجہ استبداد میں جکڑ رکھا ہے۔ اقبال غلامی کو انسان کی سب سے بڑی ذلت گردانتے ہیں اور یہی اقبال کی انسان دوست شاعری کا وصف ہے کہ وہ بار بار غلاموں کو اس حریت اور آزادی کا پیغام دیتے نظر آتے ہیں جو ان کے نزدیک شرف انسانیت ہے۔ اقبال آزادی کو انسان کا سب سے اولین بنیادی حق سمجھتے ہیں کیونکہ یہی عین فطرت ہے۔ قدرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا اور آزاد فضاؤں میں ہی انسان روحانی، سماجی اور معاشی معراج کو چھو سکتا ہے۔ اقبال سامراجی قوت سے لے کر مذہب کے نام پر فرسودہ تاویلوں کے بندھن میں بندھے ہوئے انسانوں کو ان بیڑیوں کو توڑنے پر یقین رکھتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی انسان دوست شاعری کا ذکر جب ہوتا ہے تو ان کے کلام میں اُن کا نقطۂ نظر اس نکتے کے گرد گھومتا ہے کہ اگر انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو اسے زنجیروں میں جکڑنے والے کون ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری انسانوں کی غلامی اور استحصال کے خلاف مسلسل چوٹ کرتی نظر آتی ہے۔ جوش صاحب جب انسان کی بات کرتے ہیں تو پھر دنیا میں جہاں کہیں بھی انسانیت پر ظلم ہو رہا تھا اس کے خلاف سراپا احتجاج بنے۔ وہ انسان کی جسمانی، فکری اور ذہنی غرض ہر نوع کی غلامی کے خلاف نعرہ زن رہے۔ وہ مذہب، قوم پرستی، نسل پرستی، زبان پرستی کے نام پر بھی انسانوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ انسانی مسرت اور خوشی کے داعی تھے۔ وہ انسانوں میں خوشیاں اور مسرتیں تقسیم کرنے کے داعی تھے اس لیے ان کی شاعری ایسے لاتعداد موضوعات سے بھری پڑی ہے جس میں جوش صاحب نے انسانی مسرت کو موضوع بنایا ہے، جو اس وقت ممکن ہے جب انسان غلامی اور استحصال کی زنجیریں توڑ کر آزاد فضاؤں میں سانس لے کر اپنی ذہنی و تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے جس میں ظلم، جبر، ناانصافی اور طبقاتی تفریق موجود نہ ہو۔ جو تمام انسانوں کو مساوی طور پر آگے بڑھنے کا اور ترقی کرنے کا موقع دے۔ جوش نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی قدروں کی پاسداری اور ان کے فروغ کے لیے کوشش کی ہے، ان کی شاعری میں ایک عالمگیر اخوت کا تصور جگہ جگہ جھلکتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مختلف مذاہب کے ان اوہام کو بھی توڑنے کی بھی کوشش کی جس کے ذریعے انسانوں کو مذہب کے خانے میں بانٹ کر تقسیم کی لکیر کھینچ دی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کے تمام مذاہب انسانی وحدت کے قائل ہیں اور ان کا اول و آخر منشاء ایک عالمگیر اخوت انسانی کا قیام ہے۔ اس کے علاوہ مذاہب میں جتنی بھی باتیں ہیں انہیں جوش فروع سمجھتے تھے۔ جب وہ مذہب کی بات کرتے ہیں تو وہ مولوی، پنڈت کے کرداروں کو مفاد پرست اور روایت پرست کردار قرار دیتے ہیں جن کا انسانوں کو تقسیم اور معاشرے میں افراط و تفریط کو جنم دینا ہے۔ وہ مذہب کے نام پر ان روایتوں کے سخت ناقد رہے جنہوں نے انسانوں کو ایسے بندھنوں میں باندھ رکھا ہے جس نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ختم کر ڈالا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مذہب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے، جوش کا روایت پرستوں کے خلاف بات کرنا ان کے لیے بارہا مصیبت بن کر بھی آیا لیکن وہ انسان دوستی کے جذبات میں اس حد تک رنگے ہوئے تھے کہ انہوں نے مذہبی افراد کی مخالفت کی چنداں پروا نہیں کی اور ہمیشہ انسانوں کی وحدت کی بات کی۔ وہ پیری مریدی، تقلید پسندی، ویدوں اور شاستروں کی تعلیمات جنہوں نے انسانوں کو عقل کی بجائے روایتوں کا اسیر بنا کر رکھ دیا اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اس پر برابر چوٹ کرتے رہے، وہ عقلیت پسندی کے قائل تھے اور انسانوں کو عقل جیسی دولت کے استعمال کرنے پر زور دیتے رہے جو روایتوں اور رسومات کے بندھن میں جکڑ کر زنگ آلود ہو جاتی ہے۔

حسرت موہانی ایک سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی تھے اور ان کی انسان دوست شخصیت ان کی ساری عمر کی جدوجہد سے عیاں ہے جس میں انہوں نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور اس کی پاداش میں اسیری کے طویل ماہ و سال ان کا مقدر بنے۔ حسرت کی انسان دوست شاعری کی بنیادی وجہ ان کے اندر غلامی سے نفرت اور آزادی سے

چاہت کا مادہ تھا۔ وہ چاہتے تو سرکاری ملازمت با آسانی حاصل کر کے زندگی آرام وچین سے گزارتے۔ تاہم انہوں نے دوسری راہ چنی جسے راہ عزیمت کہا جاتا ہے۔ اس راہ عزیمت پر وہی افراد ثابت قدمی سے چل سکتے ہیں جو جبر وقہر اور ظلم و انصافی پر مبنی نظام کے خلاف عملی جہد وجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ حسرت موہانی کی زندگی اسی راہ عزیمت پر چلنے کی عکاس ہے۔ اس راہ پر چلنے سے ان کی زندگی صعوبتوں اور کٹھنائیوں کا شکار ہوئی لیکن ان کے پایہ استقلال میں ذرّہ برابر لغزش بھی نہ آئی۔ حسرت موہانی کی شاعری میں انسانی دوستی کے جذبات کی جو افراط پائی جاتی ہے وہ ان کی نڈر اور بے خوف ذات سے جلا پاتی ہے کہ جس میں مظلوموں کی حمایت کے لیے اپنا تن من دھن لٹانے کی لگن شامل تھی تو اس کے ساتھ ساتھ کلمہ حق کہنے سے نہ گھبرانے کی وہ جرات رانداز نہ کہ جو انسانیت سے پیار کرنے والی عظیم شخصیات کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔

جگر مرادآبادی کی بیسویں صدی کی انسان دوست شاعری میں نمایاں حیثیت ہے۔ ان کی انسان دوست شاعری کے ساتھ ساتھ انسان دوست شخصیت، جگر کو اپنے معاصرین میں بلند مقام عطا کرتی ہے۔ ان کی شاعری نے انسان دوستی کے بے پناہ موضوعات کا احاطہ کیا لیکن فقط قحط بنگال پر ان کے رشحات قلم اس عظیم انسان دوستی شاعری کا نمونہ ہے جس میں جگر نے خون جگر اور درد دل سب ملا دیا۔ قحط بنگال کے حوالے سے لکھی ہوئی اپنی نظم میں انسان کے جینے کے حق کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے ۔ واضح رہے کہ جس وقت جگر نے یہ نظم لکھی اس وقت تک انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ وجود میں نہیں آیا تھا۔ لیکن انسان دوستی کسی اعلامیے یا منشور کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق انسانی شعور سے ہے اور ہر باشعور انسان یہ سمجھتا ہے کہ نا صرف اسے جینے کا حق حاصل ہے بلکہ معاشرے کے دیگر افراد کو بھی یہ حق اسی طرح حاصل ہے۔ جگر کی انسان دوست شاعری میں ایک خاص عنصر انسانی عظمت کا تصور ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا انسان ہونا ہی اس کا معراج ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا فرض ہے کہ وہ روشن دل ودماغ سے غور وفکر کرے اور اس کی بناء پر وہ اپنے گرد وپیش کے حالات اور سب سے بڑھ کر دنیا کو بدل سکتا ہے تا کہ جس عالم رنگ وبو میں وہ رہ رہا ہے وہ اسے گل وگلزار بنا سکے۔ ان کی شاعری میں انسان کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ حضرت انسان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جب اپنی معراج کو پہنچتا ہے تو وہ کائنات کے اسرار و رموز کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ تاہم وہ اس حقیقت کا کھلے عام اظہار کرتے ہیں کہ انسان، انسان دوستی کے جذبے سے سرشار ہو کر ہی اپنی معراج کو پہنچ سکتا ہے۔ انسانوں سے محبت کو وہ تمام عبادات اور پوجا پاٹ سے بلند گردانتے ہیں۔ وہ اس انسان کو انسانیت کا اثاثہ قرار دیتے ہیں جو احسن فطرت کا حامل ہو اور جس کے وجود سے انسانوں کو فائدہ حاصل ہو۔ ایک ایسا انسان جو اپنے ماحول کے لیے سودمند ہو اس کے لیے شرط اول ہے کہ وہ پاک طینت ہو اور اس کے اندر شر کی بجائے خیر کی قوتوں کا غلبہ ہو۔ ان کی شاعری میں پاک طینت پر زور ہے اور وہ اسے انسان کی علم وحکمت سے بھی زیادہ بڑا سمجھتے ہیں۔

منشی درگا سرور جہاں آبادی کی انسان دوست شاعری میں ان کی ''شمع انجمن''، ''قومی نوحہ'' جیسی نظموں کو بہت اہمیت حاصل ہے جس میں وطن کی محبت کے ساتھ محکومی کی کسک اور آزادی کی تڑپ ان میں دکھائی دیتی ہے۔ سرور جہان آبادی

جس پر آشوب دور میں شاعری کر رہے تھے اس وقت ان کے اردگرد غلامی کی کریہہ صورتوں کے علاوہ آزادی کے متوالوں کی بلند بانگ نعرے بھی گونج رہے تھے۔اس وقت ہندوستانی سماج میں جہاں داخلی حالات نے سرور جہان آبادی کو متاثر کیا تو اس کے ساتھ عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات بھی ان کی سوچ وفکر کے نخل سے اتر کر ان کی شاعری میں جھلک رہے تھے۔سرور جہان آبادی کی انسان دوستی شاعری کی ایک وجہ ان کی غیر معتصب سوچ اور متوازن خیالات کا آئینہ دار تھی۔ وہ آزادی اور ترقی کے حامی تھے اور وہ انسانی معاشروں کی آزادی کو انہیں لاحق سیاسی، سماجی اور معاشی بیماریوں کو علاج سمجھتے تھے۔سرور جہان آبادی کی شاعری میں حب الوطنی، انسانیت دوستی اور تہذیبی قدروں کی پاسداری کا ذکر بار بار ملتا ہے اور وہ اسے کسی سماج کی فکری و مادی ترقی کے لیے بہت ضروری چیزیں سمجھتے ہیں۔ وہ ایک انسان دوست سماج کے داعی تھے جو ہر انسان کسی خوف، اندیشے یا دھڑکے کے بغیر اپنی زندگی گزار سکے۔سرور جہان آبادی لطیف انسانی جذبات کا ترجمان شاعر بھی تھا۔انسانوں سے محبت اس کی شاعری کا ایک اہم وصف ہے۔ وہ انسانوں کی ایک دوسرے کے لیے محبت و وارفتگی کو بھی اس کمال سے موضوع سخن بناتے ہیں کہ میں اس جذبات نگاری اپنے پورے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ان کی شاعری میں یہ انسان دوستی کا رنگ بھی نمایاں ہے کہ جس میں انسانی رشتوں کی چاہت اور پیار اور اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا ملال کس طرح دل و جان میں کرب و درد کی ٹیسیں بھر دیتا ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی شاعری کنجلک فلسفیانہ موضوعات کی بجائے انسانی سماج اور اس میں بسنے والے افراد کی زندگیوں اور ان کی تکالیف کو سیدھے سادھے اور سادہ زبان میں موضوع بناتی نظر آتی ہے۔چکبست کی نظموں میں انسان کو درپیش مسائل کی کمال خوبی سے منظر نگاری کی گئی ہے۔ ہندوستانی سماج پر ان کی نظم ''سیر ڈیرہ دون'' ایک باکمال نظم سمجھی جاتی ہے جس میں وہ ایک قصبے استعارے کے طور پر استعمال کر کے ہندوستان کے واقعات و مناظر کی اپنی شعروں میں منظر نگاری کرتے نظر آتے ہیں۔چکبست لکھنوی ایک ایسے معاشرے کا حصہ تھے جو سامراج کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ ان کروڑوں ہندوستانیوں کی طرح ایک ایک شخص تھا جو اپنی بنیادی انسانی حقوق سے محروم تھے۔ایک استحصال زدہ معاشرے کے رکن ہونے کے باعث چکبست اپنے گردوپیش میں ننگ، افلاس، عسرت وتنگدستی، ظلم و جبر اور محکومیت کے کریہہ مناظر دیکھتا ہے اور اپنے لوگوں سے اپنے کلام کے ذریعے مخاطب ہوتا ہے تاکہ ان کے اندر اس جذبہ حریت کو بیدار کیا جا سکے جو کسی معاشرے کی بقا اور ترقی کے لیے کلیدی ہے۔چکبست لکھنوی کا پیغام ترقی پسندی کا پیغام تھا۔اس وقت کا ہندوستان سامراج کی غلامی کے ساتھ مذہب کے نام روایات اور سماجی رسوم کی بندشوں میں بھی بندھا ہوا تھا جو ہندوستانیوں کو شرف انسانیت کے مقام سے نیچے گرا رہی تھیں۔چکبست لکھنوی نے اس دورت میں اپنے کلام میں جو کہا وہ اپنے دور کے تقاضوں کے لحاظ سے ہر صورت ترقی پسندانہ شاعری تھی جس کا اول و آخر مقصد انسانیت نوازی اور انسان دوستی تھا۔چکبست کا دل حب الوطنی سے معمور تھا اور لوگوں کو از کار رفتہ رسومات سے چھٹکارا پانے کی ترغیب دیتے تھے۔ وہ معاشرے میں ایسی تبدیلیوں کے ہمنوا تھے جو ان کے

کروڑوں ہم وطنوں کو آزادی، حریت فکر اور علم و آگاہی فراہم کر سکیں۔ یہ چکبست لکھنوی کی شاعری کا ہی خاصہ ہے کہ ان کی شاعری اثر آفرینی کے ایسے خیالات و جذبات سے پر تھی کہ وہ اس میں دردمندی اور فکرمندی جھلکتی نظر آتی ہے۔

تلوک چند محروم محروم نے اپنی شاعری کے ذریعے انسان دوستی، مذہبی رواداری اور حب الوطنی کا فروغ دیا ہے اور ان کی شاعری میں ایسی بے شمار نظمیں ہیں جو اپنے وطن اور لوگوں سے چاہت کا برملا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ کسی بھی سامراجی تسلط سے آزادی کے لیے انفرادی سطح پر جدو جہد نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے اجتماعی جدو جہد کی ہر حال میں ضرورت ہوتی ہے۔ اجتماعی جدو جہد کا بنیادی فلسفہ یہ ہوتا ہے کہ عوام کو روشن خیالی کی ترغیب دی جائے۔ اور آزادی سے قبل ان کے شعور کو اس سطح پر لے جایا جائے کہ وہ انسان دوستی اور وطنیت کے جذبات سے سرفراز ہو جائیں۔ محروم کو دور طالب علمی سے ہندوستانیوں کی بے کسی و بے بسی کا احساس تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کی اس محرومی کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی شاعری کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہی پیغام دیا کہ وہ مذہبی تفریق کو بھلا کر یکجا اور ہم قدم ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لیے مشترکہ جدو جہد کریں۔ وہ مذہبی عدم برداشت اور تشدد کے سخت خلاف تھے۔ وہ ان اقدار کی پاسداری پر جہاں زور دیتے ہیں تو اس کے ساتھ ان کے فروغ کے لیے بھی شاعری کا سہارا لیتے ہیں تو ان کے تخیل میں پروان چڑھنے والا وہ معاشرہ ظہور پذیر ہو سکے جہاں ظلم و جبر، استحصال، ناانصافی اور عدم مساوات کا شائبہ تک نہ ہو۔ یہ محروم کی شاعری کا ہی خاصہ ہے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کو موضوع سخن بناتے ہیں جن میں الجھ کر نوع انسانی اپنی راہ سے بھٹک چکی ہے اور وہ اسے اس راہ پر چلنے کی بار بار تلقین کرتے ہیں جو اسے شرف انسانیت کے منصب پر فائز کر سکے جس کے لیے وہ مذہب، رنگ، نسل اور علاقے کی تخصیص کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے ان عالمی موضوعات کو بھی اپنے کلام کا حصہ بنایا جو پوری انسانیت سے متعلق ہیں۔

مخدوم محی الدین کی شاعری ارتقاء پذیر رہی۔ ان کی سماجی و انسانی دوست شاعری کا اسلوب بدلتا رہا۔ ابتداء میں جب انہوں نے انسان دوست شاعری کا علم اٹھایا تو انسانوں کے ساتھ ہونے والے ظلم پر وہ کبیدہ خاطر ہو کر ایک ایسا انداز بیان اپناتے ہیں جس میں غصہ، جلال اور گھن گھرج، تلخی اور نفرت ہے، ان کی اس شاعری کے پس پردہ وہ مشاہدات ہیں جس میں انہوں نے انسانوں کو کولہو کے بیل کی طرف ظلم کی چکی میں پستے دیکھا، محرومیوں اور ناانصافیوں کا ایک دراز سلسلہ جس میں انسانیت کڑھتی اور سسکتی ملتی ہے۔ ان کے اس دور کے کلام میں ایسی گھن گرج اور تلخی کا اظہار ہے کہ جس میں وہ اس نظام زندگی کو خاکستر کرنے کا اعلان کرتے ہیں جس میں ظالم مظلوم کو مسلسل اپنے پنجہ استبداد میں دبوچے ہوئے ہے۔ مخدوم کی انسان دوست شخصیت کا خاصہ تھا جو ان کی شاعری کی صورت میں ڈھلا کہ وہ محنت کشوں کی تحریک میں شعر و ادب کی راہ سے داخل ہوئے، انہوں نے جب مزدوروں کے مسائل پر انقلابی شاعری شروع کی تو ان کے سیاسی عقائد میں کافی پختگی آ چکی تھی انہوں نے اس مقصد کے لیے اپنی سرکاری نوکری تک سے استعفیٰ دے دیا اور جب انہوں نے آزادی، جمہوریت اور مساوات کی بات کی تو

حیدرآباد دکن میں ان کا یہ مطالبہ ایک جرم کے کھاتے میں شمار کیا گیا اس لیے ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ بنا اور انہوں نے سزا بھی کاٹی۔ وہ سامراج دشمنی کے جذبات سے سرشار تھے، وہ سامراج کی پالیسیوں کو معاشرے کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے کیونکہ ان پالیسیوں نے انسانوں کی ذہنی تخلیق اور فکری صلاحیتوں کو سلب کر دیا اور دوسری طرف یہ پالیسیاں استحصال اور ظلم پر مبنی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہیں جس میں انسانوں سے ان کا انسانیت کا اثاثہ بھی چھین لیا گیا ہے۔ مخدوم کے احساس و آگہی نے وقت گزرنے کے ساتھ قوت پائی جس میں ان کی فکر و سوچ نے مختلف مدارج طے کر کے اس انسان دوست معاشرے کی تخلیق کے بارے میں دہائی دی کہ جس میں حریت فکر، کامل آزادی اور فکری آزادی پر کوئی قدغن نہ ہو۔

فیض احمد فیض جہاں رومان اور حقیقت کے شاعر ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ ان کی انسان دوست شاعری نے انہیں اس مقام پر فائز کر دیا کہ جس میں ان کا بمشکل ہی کوئی ہم عصر مل پائے۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو جب موضوع سخن بناتے ہیں تو وہ نہ صرف صاحب طرز شاعر کے روپ میں ابھر کر سامنے آتے ہیں بلکہ وہ ان کے گہرے شعور اور ادراک کا بھی پتا دیتے ہیں۔ فیض کی انسان دوستی شاعری نے انہیں جو قبولیت عام بخشی اس کا اظہار ان کی عالمی سطح پر پذیرائی سے بھی عیاں ہے۔ فیض کی شاعری سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا تعلق عوام سے کبھی نہیں ٹوٹا، چاہے وہ اپنے ملک میں رہے یا انہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی، فیض صاحب نے ہمیشہ انسانیت، اسے لاحق دکھوں اور اس انسانیت کے لیے مسرت و شادمانی کے لمحوں کے حصول کی تمنا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ فیض عظمت انسان کے قائل تھے اور جب اس انسان کو محکومی، مجبوری اور غلامی کی بیڑیوں میں جکڑا دیکھتے ہیں تو فیض کے قلم وہ فن پارے جنم لیتے ہیں کہ جن کی بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ فیض کی انسان دوست سوچ و فکر کا اندازہ ان کے اپنے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل نہیں بلکہ افادی فعل ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت اور رنگینی پیدا ہو جس حسن کا ہماری انسانیت میں اضافہ کرے جس سے تزکیہ نفس ہو جو ہماری روح کو مترنم کرے جس کی لو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو صرف حسین ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر سلامت اللہ، مشمولہ: ''فکری و نظری مباحث (ترقی پسند تنقید۔۔۔ پون صدی کا قصہ ۲۰۱۱ء۔۱۹۳۶ء)، ناشر: سانجھ پبلیکیشن، فروری ۲۰۱۲، ص ۲۱۶۔

۲۔ مرزا ظفر الحسن، ''مخدوم اور کلام مخدوم''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۸، ص ۸۹ تا ۹۱۔

۳۔ نورالحسن ہاشمی، ''ولی: ہندوستانی ادب کے معمار''، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۲۳۔

۴۔ اوصاف احمد، ''بیسویں صدی کی اردو شاعری''، بک ہوم، لاہور، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۴۶۔

۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۰۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۷۔ ایضاً، ص ۶۵

۸۔ شبنم شکیل، ڈاکٹر سلیم اختر، خالدہ حسین، ''خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی''، وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۵، ص ۱۵۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ احمد، اوصاف: ستمبر ۲۰۰۳ء، ''بیسویں صدی کی اردو شاعری''، بک ہوم، لاہور۔

۲۔ اعظمی، خلیل الرحمٰن: ۲۰۰۲ء، ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

۳۔ سلامت اللہ، ڈاکٹر: فروری ۲۰۱۲ء، مشمولہ، ''فکری و نظری مباحث (ترقی پسند تنقید ___ پون صدی کا قصہ ۲۰۱۱ء۔۱۹۳۶ء)، سانجھ پبلیکیشن.

۴۔ شکیل، شبنم، ڈاکٹر سلیم اختر، خالدہ حسین،: ۲۰۰۵ء، ''خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی''، وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان، اسلام آباد

۵۔ ظفر الحسن، مرزا: ۲۰۰۸ء، ''مخدوم اور کلام مخدوم''، مکتبہ دانیال، کراچی۔

۶۔ ہاشمی، نور الحسن: ۱۹۹۰ء، ''ولی: ہندوستانی ادب کے معمار''، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔